استفسارات

احمد جاوید

محترمی۔ السلام علیکم

میرا تعارف یہ ہے کہ فلسفے اور ادب کا طالب علم ہوں۔ تیس سال سے یہی اوڑھنا بچھونا ہے۔ علامہ اقبال کو بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ہو یا فلسفہ، دونوں میں فکر کو جذبات میں یا جذبات کو فکر میں ڈھالنے کا عمل اتنا زیادہ ہے کہ قاری اپنے ذہن کے اس حصے کو جو افکار و نظریات کے مطالعے میں کام آتا ہے، سن ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس تجربے سے بار بار گزرنے کے بعد اب میرا یہ حال ہے کہ علامہ کے فلسفہ و شعر سے میری دلچسپی کی نوعیت علمی نہیں رہی، جذباتی ہو گئی ہے۔ اب انہیں پڑھنے بیٹھتا ہوں تو اس کا محرک ذہن نہیں ہوتا۔ کوئی جذباتی یا اخلاقی تقاضا ہوتا ہے جو مجھے اُن کی طرف لے جاتا ہے۔ آدمی طبعاً Idealist ہوتا ہے۔ کیا خبر یہ میرا چھپا ہوا Idealism ہی ہو جو مجھے اقبال سے جوڑے رکھتا ہے۔ وہ چیزوں کو جس طرح تصور میں منقلب کرتے ہیں، اس سے چیزیں اپنی واقعیت سے نکل جانے کے باوجود، زیادہ خوبصورت اور زیادہ مکمل لگنے لگتی ہیں۔ یہ حسن و کمال بہت تسکین بخش ہے۔ دماغ اس تسکین کو قبول نہیں کرتا تو دل چاہتا ہے اس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ خواہ مخواہ رنگ میں بھنگ ڈالتا ہے۔ اور مشکل یہ ہے کہ یہ صورت حال صرف شعر اقبال تک محدود نہیں ہے۔ Reconstruction میں بھی بیشتر مقامات پر پڑھنے والا اسی تجربے سے گزرتا ہے۔ اس کتاب میں جتنے بھی تصورات بیان ہوئے ہیں ایک آدھ کو چھوڑ کر سب کے سب ایک ایسی مابعد الطبیعیاتی منطق پر کھڑے ہیں جو حیرت انگیز طور پر روایتی نہیں ہے۔ مابعد الطبیعیات کی روایت نے جو سیڑھی تیار کی تھی، علامہ اسے اوپر پہنچنے کے لیے نہیں بلکہ نیچے اترنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ان کا تصور وجود ہو یا نظریۂ حقیقت، دونوں انسان کو مرکز بنا کر وضع ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ خدا بھی انسانی Symphony کا ایک note معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے کہ خدا کے وجود کی ضرورت بس اتنی ہے کہ انسان کی تکمیل میں صرف ہو جائے۔

مجھے اندازہ ہے کہ یہ محض ایک تاثر ہے جو فکرِ اقبال کا احاطہ یا درست ترجمانی نہیں کر سکتا، لیکن میں اس بات سے آنکھ نہیں چرا سکتا کہ ان کی فکر، علمی ہو یا اخلاقی، عقلی یا ہو یا وجدانی، جس نقطے پر تمام ہوتی ہے وہ نقطۂ تاثر ہی ہے۔ علامہ کا ہر نظریہ بیان میں مکمل ہو کر استدلالی نہیں رہتا بلکہ تاثراتی ہو جاتا ہے۔ مجھے تاثر کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ نٹشے نے اس کی فلسفیانہ قدر و قیمت کو آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ اقبال اپنی تصور سازی اور فکر بندی کے Method میں اسی حکیم دیوانہ کے متبع ہیں جس نے موجود

ہونے کی ساری فضا کو الٹ کر دکھا دیا اور اسے ایک بالکل نیا سیاق وسباق دیا۔ میرا مقصد تو بس اتنا سا ہے کہ تصورات اقبال کو فلسفے کے متداول نظام استدلال کی روشنی میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش میں ناکامی کا سبب معلوم ہو جائے۔ باقی میں اس بات کو پوری طرح مانتا ہوں کہ زندگی کی اساسی معنویت اور اس تک رسائی کے کچھ راستے عقل و استدلال کی پہنچ سے باہر ہوتے ہیں اور ان پر قدم رکھنے کے لیے دماغ سے زیادہ احساس اور جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارے لیے اقبال کی حیثیت سکہ رائج الوقت کی ہے جو ہر چیز فراہم کرنے کی ضمانت رکھتا ہے۔ انھیں حوالہ بنائے بغیر ہم زندگی کے حقائق و مظاہر تک پہنچنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ اس رویے نے جہاں بہت سے مسائل حل کیے ہیں وہاں کچھ مسائل پیدا بھی کیے ہیں۔ مثلاً یہی کہ اُن کے افکار وخیالات پر ہمارے ایقان واعتماد نے ہمیں اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا کہ ان افکار و خیالات کی اندرونی ساخت کا تجزیہ کیا جائے تا کہ ان کی productivity کا جوہر دریافت ہو کر ایک زندہ تسلسل میں ڈھل سکے۔ اور یہ کوئی مفروضہ نہیں ہے۔ خود اقبال نے اپنی روایت کے ان حصوں کو جو ان کے لیے قابل قبول تھے، مسلسل رکھنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ مثال کے طور پر رومی کے ساتھ اُن کی نسبت کا جائزہ لیں۔ صاف نظر آتا ہے کہ اقبال نے اس سمندر کی گہرائی اور روانی کے اصول کو بقدرِ استطاعت خود میں جذب کر کے اس کے تسلسل کی مؤثر صورت نکالی۔

مختصر یہ کہ از راہِ کرم میری اس بات کو اعتراض کے بجائے اشکال سمجھا جائے کہ علامہ اقبال کے نظریات اور تصورات عملی غایت اور علمی دروبست رکھنے کے باوجود جب بیان میں مکمل ہوتے ہیں تو رومانوی اور unverifiable کیوں ہو جاتے ہیں؟ یہ چیز ان کے خیالات کے ماننے والوں کو بھی ایک دوراہے پر لا چھوڑتی ہے، اور نہ ماننے والوں کو بھی۔ اسی لیے مجھے فی الحال یہ محسوس ہوتا ہے کہ فکرِ اقبال کی جمالیاتی حیثیت زیادہ ہے اور علمی و عملی کم۔ اگر یہ احساس غلط ہے تو میں اصلاح کا متمنی اور منتظر ہوں۔ شکریہ

مخلص

احمد عبداللہ

جواب

وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہ۔ آپ کا خط دل چسپ بھی ہے غور طلب بھی۔ میرا خیال ہے کہ ہم گفتگو کا آغاز اس فقرے سے کر سکتے ہیں کہ کسی تصور یا نظریے کا نقطۂ تکمیل جمالیاتی ہوتا ہے۔ یوں ہم اُس عامیانہ پن اور سطحی یکسانی سے بچے رہنے کا سامان کر سکتے ہیں جو اقبالیات کے مباحث پر کسی سخت خول کی طرح چڑھ چکے ہیں۔ آیئے اس بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔

وہ روایت جس سے اقبال متعلق ہیں، بیشتر اسی بنیاد پر کھڑی ہے کہ جمالیاتی جوہر پیدا کیے بغیر فکر مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس جمالیاتی جوہر کی تفصیل یہ ہے کہ فکر ہو یا تجربہ، ادراک اور اظہار کی سطح پر مکمل ہو کر اپنے موضوع پر زائد ہو جاتا ہے۔ امید ہے یہ بات آپ کے لیے غیر مانوس نہیں ہوگی کہ یہ زیادت ہی فکر و احساس کو موضوع کا احاطہ کرنے کے قابل بناتی ہے۔ ادراک اور اظہار کا شے پر زائد ہو جانا جس حقیقت پر دلالت کرتا ہے وہ اپنی ماہیت میں جمالیاتی ہے۔ یہی وہ جہت ہے جو حقیقی پن کے ثبوت کے منطقی اور تجربی حدود کو توڑ کر چیزوں میں self transcendence کے جوہر کو واقعی اور لائق اثبات بناتی ہے۔ یہاں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ مابعد الطبیعی فکر اور طرزِ احساس، اور بہت کچھ ہونے کے باوجود اساسی طور پر جمالیاتی ہوتا ہے۔ یہ فکر اگر تجربی امور کو اپنا موضوع بنائے تو بھی اس کی تحقق خوئی اور کمال جوئی برقرار رہتی ہے۔ تجربیات خلقی طور پر اعتباری اور ادھورے ہوتے ہیں۔ یہ ذہن کے حدود اثبات کے اندر اندر ہی موجود ہوتے ہیں۔ مابعد الطبیعی تناظر ان حدود میں وہ غیر متناہی پن پیدا کر دیتا ہے جس سے چیزوں کے ذاتی نقص اور مبنی بر اعتبار ہونے کی حالت کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل صورت ہی نہیں پکڑ سکتا اگر شے کو اس کی حقیقت سے جوڑ کر یا اس میں ضم کر کے نہ دیکھا جائے۔ شے اور حقیقت شے میں عینیت کی یہ تلاش شعور کی جمالیاتی قوت کے بغیر ناممکن ہے۔ شے کا حقیقی ہونا اتنا پھیلاؤ رکھتا ہے کہ خود شے میں نہیں سماتا۔ اُس پھیلاؤ کی ایسی پیمایش جس میں شے کو منہا نہ ہونے دیا جائے، انھی وسائل سے ممکن ہے جو آدمی کے جمالیاتی شعور کی ملکیت ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں چیز حقیقی ہے تو اس میں یہ اعلان لازماً مضمر ہوتا ہے کہ یہ چیز اپنے وجودی معیار پر ناقص نہیں ہے۔ اور یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ کمال، جمال ہے اور جمال، کمال۔ تکمیل خواہ جزوی ہو، لامحالہ ایک جمالیاتی تناظر پیدا کر لیتی ہے۔

یہ ہے وہ اصولی پس منظر جسے نظر انداز کر کے اقبال کا مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کی فکر کا محرک اور غایت، ظاہر ہے کہ مابعد الطبیعی ہے۔ اس فکر کو اپنی تشکیل کے لیے جو ضروری اجزا درکار ہیں، وہ

اقبال کے ہاں بھی موجود ہیں مگر قدرے مختلف توازن اور تناسب کے ساتھ۔ اس اختلاف کا بڑا سبب یہ ہے کہ اقبال کے فوری اہداف اخلاقی' نفسیاتی اور تاریخی ہیں۔ ان کی تقریباً تمام ضروریات عملی نوعیت کی ہیں۔ روایتی مابعد الطبیعی فکر تصورِ خدا پر منتج ہوتی ہے، جبکہ اقبال کا معاملہ یہ ہے کہ ان کا تصور خدا بھی اس تصورِ انسان کا ایک حصہ ہے جو ان کی فکر کا مدار و محور ہے۔ بحیثیت مجموعی، روایتی مابعد الطبیعی فکر کے لیے یہ ایک اجنبی رویہ ہے' اور غمازی کرتا ہے کہ اقبال نے عبدالکریم الجیلی پر کام کرتے ہوتے ان کا اثر خاصی گہرائی میں قبول کیا تھا۔ یہ جیلی ہی تھے جنہوں نے انسان کامل کے الہیاتی تصور میں پہلی مرتبہ ناسوتیت داخل کی۔ خیر یہ ایک الگ موضوع ہے کہ اپنے تصور انسان کے مابعد الطبیعی دروبست میں اقبال نے عبدالکریم الجیلی سے کیسا اور کتنا استفادہ کیا۔ سر دست ہم یہ دیکھنے چلے ہیں کہ فکرِ اقبال کی مجموعی پیش رفت کا ایک بنیادی اسلوب جمالیاتی ہے' اور یہ پیش رفت جہاں تمام ہوتی ہے اُن مقامات کو جمالیاتی شعور کی مدد بلکہ رہنمائی کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس بات کو یوں کہہ لیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں کہ اقبال جس بیان کے خالق ہیں' اُس کے معنی تو اخلاقی یا کچھ اور ہو سکتے ہیں، لیکن معنویت بڑی حد تک جمالیاتی ہے۔ یہی وہ وصف ہے جو انہیں اس روایت کا حصہ بناتا ہے جس میں بوعلی سینا' احمد غزالی' حلاج' ابن عربی اور رومی ایسے نام شامل ہیں۔ اس عظیم الشان عرفانی روایت کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے وجود اور اس کی حقیقت کی تحقیق میں اُس امر کو مرکزی حیثیت دی جو ناظر و منظور یا عارف و معروف دونوں میں مشترک ہے: جمال۔ جمال جو حق کی اصل ظہور ہے، انسان کے لیے اس قابلیت اولیٰ کا درجہ رکھتا ہے جو حق کی ورائے ادراک Presence کو قبول کرتا ہے اور اسے ایسی معنی خیزی کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے جس سے عقل وغیرہ کا کام چلتا رہتا ہے۔

اس روایت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر موضوع پر اس طرح کلام کیا جاتا ہے کہ تین باتیں یکجائی کے ساتھ سامنے آ جاتی ہیں۔ (۱) صورت (۲) حقیقت اور (۳) ان کے اجتماع تک پہنچنے کا ذریعہ۔ یعنی شئے' حقیقت شے اور اس نقطۂ عینیت کی دریافت کا منہاج جس پر اُس کا وجود قائم ہے، اور جس سے اُس شے کا وجودی مرتبہ متحقق ہوتا ہے۔ اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ اس منہاج تحقیق کی بدولت اُس نسبت کی تعیین بھی ہو جاتی ہے جو عارف کو معروف یعنی حق یا حقیقت، اور اُس کے مظاہر سے ہے۔ اس نسبت کی اصولاً دو انواع ہیں: عقلی اور عشقی۔ دونوں کا حاصل ایک ہے: معرفت، مگر اس کی کیفیت مختلف ہے۔ ایک کا مزاج تفصیل اور حصول کا ہے جبکہ دوسری کا اجمال اور حضور کا۔ عقلی نسبت میں احاطے کا رنگ پایا جاتا ہے اور عشق میں ارتکاز کا۔ اس تقابل کو بہترین صورت میں دیکھنا ہو تو احمد غزالی کی شہرہ آفاق کتاب ''سوانح'' کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ یہ مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اقبال کے تصورِ عشق کی متعدد بنیادیں اس کتاب میں ملتی ہیں۔

اب اگر اقبال کے بنیادی تصورات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات بالکل غیر مبہم انداز میں نظر آتی

ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی عارفانہ روایت کے دونوں دھاروں میں بہنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے لیے یہ شناوری اس لیے زیادہ مشکل نہیں ثابت ہوئی کہ وہ ایک باقاعدہ مفکر اور بڑے شاعر تھے۔ ان دونوں اوصاف کے اجتماع نے ان کے لیے قلب اور ذہن کے آزادانہ مگر ہم مقصد عمل کو ممکن بنا دیا۔ جیسا کہ کئی جگہوں پر انہوں نے خود کہا ہے:

ز شعر دلکش اقبال می تواں دریافت
کہ درس فلسفہ مے داد و عاشقی ورزید

ز اقبال فلک پیما چہ پرسی
حکیم نکتہ دان ما جنون کرد

عطا اسلاف کا جذب دروں کر
شریک زمرۂ لایحزنوں کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اصل میں اقبال کا بڑا مقصد یہ تھا کہ ذہن اور قلب کو یک سو کیا جائے اور دماغ کی تمام طاقتوں کو دل کے تابع رکھا جائے۔

نقشی کہ بستہ ئی ہمہ اوہام باطل است
عقلی بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

وہ اس مقصد کے حصول میں کہاں تک کامیاب رہے؟ فی الحال یہ سوال ہمارا موضوع نہیں ہے۔ لیکن عقل و دل کے اجتماع کا تصور ہی اپنی بنیادی ساخت میں جمالیاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے وہ خیالات جو نظم میں بھی بیان ہوئے اور نثر میں بھی، میڈیم کے تقاضوں کے پیدا ہونے والے امتیازات تو رکھتے ہیں مگر ان میں وہ جوہری فرق نہیں پایا جاتا جو ایک کے مقاصد اور حاصلات کو دوسرے کے مقاصد اور حاصلات سے بلحاظ ماہیت مختلف رکھتا ہے۔ روایتی اصطلاح میں اقبال حصول و حضور کی تالیف کرتے ہیں، ان کے لازمی امتیاز کے باوجود۔

ان کے کسی بھی تصور کا جائزہ لیں، یہ چیز ابتدا ہی میں واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تصور کئی منتہاؤں کو جوڑ کر وضع ہوا ہے۔ ان میں سے کچھ actual ہیں اور کچھ ideals کو actualize کیسے کیا جائے؟ ان کے تمام تصورات اسی سوال کا سامنا کر کے تکمیل پاتے ہیں۔

یہاں آپ سے درخواست ہے کہ اس بات پر ضرور غور فرمائیں کہ اقبال کا سارا کام علم الحقائق کی روایتی مثلث یعنی تصورِ خدا' تصورِ کائنات اور تصورِ انسان ہی کی ایک تالیف ہے۔ synthesization کا یہ عمل مسلم دنیا میں اقبال کے بعد اگر کہیں دکھائی بھی دیتا ہے تو اس کی سطح اتنی بلند نہیں ہے' اور اس کی معنویت میں مابعد الطبیعیت اور کلیت کا عنصر بھی تقریباً مفقود ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہی ہے کہ اب نظریہ سازی میں اس تخیل کا کوئی کردار نہیں رہا جو جمالیاتی شعور کی faculty ہے۔ دوسری طرف اقبال کو دیکھیں کہ دین اور قومیت ایسے موضوعات پر بھی اُن کا جمالیاتی شعور بالآخر چیزوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور مسئلے کے نظری اور عملی اطلاقات پر غالب آ جاتا ہے۔

یہاں سے اگر کچھ دیر کے لیے ایک اور طرف مڑ جائیں تو امکان ہے کہ ہم اپنے ایک مسئلے کا زیادہ بامعنی انداز میں سامنا کر سکیں گے۔ انسانیت' مابعد الطبیعی اقدار پر استوار ہو تو اُس کا باطنی اور خارجی یا مجبوراً یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ نفسیاتی اور تہذیبی سٹرکچر فطری طور پر عملاً اخلاقی اور بلحاظ کیفیت جمالیاتی ہوگا۔ مابعد الطبیعی تعین اپنی ماہیت میں جمالیاتی ہوتا ہے اور غایت میں اخلاقی۔ ہم دور کیوں جائیں' خود اپنے دین کے ساتھ اپنی وابستگی کی ایمانی اور عملی قوت کو نسبتاً زیادہ گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ بروے کار لا کر دیکھیں تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اخلاق اور حسن کی وہ عینیت ہم سے اوجھل رہ جائے جو اسلام کا مزاج ہے۔ اس دین میں اخلاق اور حسن جمال باعتبار اصل ایک ہے۔ دونوں کی بنیاد اُس ترفع پر ہے جو آدمی کو ہستی کے پست مدارج کا اسیر نہیں ہونے دیتا۔ یہ پستیاں کیا ہیں؟ شر اور بدصورتی۔ دونوں ہم معنی ہیں۔ اقبال نے اس ترفع کو خاص طور پر شاعری میں اتنے شکوہ اور تنوع کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہم خود کو موجود ہونے کی بلند تر حالتوں سے گزرتا محسوس کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس احساس کی بناوٹ معروف معنی میں علمی نہیں ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ اس تجربے سے گزرنے والا جو کچھ حاصل کرتا ہے اس کا طریقِ حصول علمی نہیں ہے، اور اسے علم نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انسان کے داخلی تجربات یعنی تصدیق ناپذیر (unverifiable) احساسات آخر کوئی معنویت تو رکھتے ہیں۔ کیا یہ معنویت فکری اور علمی افادیت سے عاری ہے یا ہو سکتی ہے؟

یقیناً یہ نکتہ آپ کی گرفت سے باہر نہیں ہوگا کہ فکرِ اقبال جس روایت کے تسلسل کی تاحال آخری کڑی ہے' وہاں فکر کی صحت کے علاوہ تاثیر کو بھی ضروری گردانا جاتا ہے۔ مذہبی فکر کا وہ حصہ جس کا موضوع انسان ہے' اسی اصول پر تشکیل پاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ''(اقبال) کی شاعری ہو یا فلسفہ' دونوں میں فکر کو جذبات میں یا جذبات کو فکر میں ڈھالنے کا عمل اتنا زیادہ ہے کہ قاری اپنے ذہن کے اس حصے کو جو افکار و نظریات کے مطالعے میں کام آتا ہے' سن ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے''۔ اس احساس کا تو کچھ نہیں کیا جا سکتا، البتہ اتنی گزارش ضرور ہے کہ اس فقرے سے جو تعمیم نکلتی ہے وہ ضرورت سے زیادہ ہے بلکہ بہت زیادہ۔ شعر کی حد تک تو یہ بات ٹھیک ہے کہ اقبال عام طور سے فکر اور جذبے (نہ کہ

جذبات) کو ایک کر دیتے ہیں، لیکن اُن کے خطبات وغیرہ کے بارے میں ایسی رائے قائم کرنا کسی بڑی غلط فہمی کے بغیر ممکن نہیں۔ اقبال کے موضوعات میں سے کوئی ایسا موضوع چن لیں جو خطبات میں آیا ہو اور شاعری میں بھی۔ اس کے تقابلی مطالعے سے واضح ہو جائے گا کہ جس احساس نے آپ کے اندر مستقل جگہ بنالی ہے وہ بداہتہً بے اساس ہے۔ نثر میں تو علامہ کا یہ عالم ہے کہ بعض مقامات پر وہ بالکل clinician معلوم ہوتے ہیں۔ خصوصاً اُن مباحث میں جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے۔ ہاں آپ کی اس بات کو ردّ کرنا خلاف دیانت ہوگا کہ انسانی خودی کا تصور کہیں کہیں انسانیت کو الوہیت پر غالب کر دیتا ہے۔ میری رائے بھی یہی ہے کہ اقبال کے جہانِ فکر کے قطبین، یعنی خدا اور انسان، کے درمیان وہ توازن ملحوظ اور محفوظ نہیں رہتا جو مابعد الطبیعیات کی پوری روایت کا خاصہ ہے، اور جس سے صرف نظر کر کے تفکر کی کسی نوع کو مذہبی نہیں کہا جا سکتا۔ خدا پر کلام کرتے ہوئے علامہ logical Positivism تک پہنچنا بھی گوارا کر لیتے ہیں جبکہ انسان کا تحقق ان کے ہاں اس درجہ Metaphysical ہو جاتا ہے کہ یوں لگنے لگتا ہے کہ نظام الحقائق کا مرکز خدا نہیں ہے بلکہ آدمی ہے۔ یہ بات اشکال کی حیثیت سے بھی valid ہے اور اعتراض کے طور پر بھی درست ہے۔ ہاں یہ بہر حال سوچا جا سکتا ہے کہ اقبال جس روایت سے لڑنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے، اس کے خلاف اپنے موقف کو مضبوط بنانے کے لیے ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ انسان کے وجودی اور حقیقی اثبات میں ایک مابعد الطبیعی معنی اور تحکم پیدا کریں، اور جس تصورِ حقیقت نے انسان پر اپنے دروازے بند کر لیے تھے، اسی کی منطق سے کام لے کر انسان کو عین اُس کے قلب میں جاگزیں کر دیں۔ ہستی کے روایتی دروبست سے باہر نکلے بغیر، اقبال نے انسان کی وجودی انفرادیت اور حقیقی امتیاز پر اس مباہاتی انداز سے زور دیا ہے کہ کہیں کہیں خدا کی حیثیت بھی دب جاتی ہے۔ ذات وخودی کے مبحث میں بات جب تک اخلاقی اور عملی حدود میں محدود رہتی ہے، کوئی اُلجھن سر نہیں اُٹھاتی، لیکن جونہی گفتگو مابعد الطبیعیات کی اقلیم میں داخل ہوتی ہے، قاری بعض لاینحل دشواریوں کی زد میں آ جاتا ہے۔ انسان کو وجود کی حقیقت کا مستقل حامل ثابت کرنے کے لیے اقبال کو یہاں تک جانا پڑا کہ وہ ذات خداوندی میں بھی ایک طرح کی ناسوتیت دیکھنے لگے۔ مثلاً اللہ کے علم، خلاّقی، قدرت وغیرہ کے بارے میں اُن کے تصورات اسی نوع کے ہیں۔ اسی طرح خودی سے خودی یا ذات سے ذات کے صدور کا نظریہ اس اعتبار سے خاصا تعجب خیز ہے کہ اس میں وہ نتیجہ نظر انداز کر دیا گیا جو اس دعوے سے لازماً برآمد ہوتا ہے۔ یعنی خدا اور انسان کی اثنینی عینیت اور یہ ایسا نتیجہ ہے جس کے لیے محال کا لفظ ناکافی ہے۔ اس طرح کی پیچیدگیوں سے نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ اقبال کی فکر کے اس حصے کا خاص طور سے جائزہ لیا جائے جس کا سیاق وسباق مابعد الطبیعی ہے۔ ہم ایک بہت بڑی عارفانہ اور حکیمانہ روایت کے وارث ہیں۔ ان مباحث میں اقبال کہاں صحیح ہیں اور کہاں غلط، اس کا فیصلہ اسی روایت کی روشنی میں ممکن ہے۔ اس کے لیے ہمیں مطالعۂ فکرِ

اقبال کی موجودہ روش کو چھوڑنا پڑے گا جو ہمیں ہماری قابل فخر علمی روایت ہی سے نہیں بلکہ خود اقبال سے بھی دور لے جا رہی ہے۔ اس روش پر چلنے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہماری کل جمع پونجی محض چند دعوے ہیں جو ہم وقت بے وقت الاپتے رہتے ہیں۔

بہر حال اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اقبال کے سلسلے میں کسی مخالفانہ چلن کی بنا ڈال دی جائے۔ علمی لحاظ سے تو ایسے کسی قصد یا خیال کی لغویت ظاہر ہی ہے، دینی و اخلاقی اعتبار سے بھی یہ رویہ تباہ کن ہے۔ ملت اسلامیہ کے حقیقی تشخص کی باز آفرینی اور صورت گری کا کوئی عمل اقبال کی شمولیت کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ بات اتنی بدیہی اور یقینی ہے کہ انکار تو درکنار، اس سے اختلاف کرنے کے لیے بھی جہالت اور پستی کی ہر انتہا کو پار کرنا ضروری ہے۔ ہماری مراد تو بس اتنی سی ہے کہ اقبال کا مطالعہ اُسی طریقے پر ہونا چاہیے جسے خود انھوں نے اپنے پیشرووں کے لیے اختیار کیا تھا۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہماری روایتی فضا میں اقبال کی فکر اپنے بعض گوشوں میں اوریجنل ہے، اور اوریجنل بات نقطۂ آغاز ہوتی ہے نہ کہ حرف آخر۔ اسے حتمی اور فیصلہ کن سمجھ لینے کا انجام وہی ذہنی جمود ہے جس سے اقبال ساری عمر لڑتے رہے۔

محترم! جی تو چاہتا ہے آپ کے گرامی نامے کے تمام مندرجات پر گفتگو کی جائے لیکن ڈر ہے کہ یہاں وہ بے محل ہوگی۔ جو امور میری دانست میں زیادہ اہم ہیں، کوشش کر رہا ہوں کہ اُنھی تک محدود رہا جائے۔ جو بات صحیح معلوم ہو، اُس کی تائید سے دریغ نہ رکھا جائے اور جہاں اختلاف محسوس ہو، وہاں بھی تکلف سے کام نہ لیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اقبال کے فکری منہاج ہی سے اختلاف رکھتے ہیں یا کم از کم اُس سے متفق ہونے کے لیے کوئی مضبوط دلیل نہیں پاتے۔ اگر یہ خیال غلط نہیں ہے تو پھر ہمیں چاہیے کہ ان کے منہاج تفکر کی درست تشخیص تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ آپ کے فرمودات سے لگتا ہے کہ اقبال کو آپ اُن مفکرین میں شامل سمجھتے ہیں جن کا مادۂ فکر اور غایت تفکر مابعد الطبیعی ہے۔ وہ بھی الہیاتی مباحث میں اس فلسفے کو دخیل کرتے ہیں جو حیرت انگیز طور پر تجربیت اور مثالیت کا آمیزہ ہے۔ مجھے اس تجزیے کے ایک جز سے اتفاق ہے جس کا اظہار اوپر ہو چکا ہے۔ مگر یہ جز ظاہر ہے فکرِ اقبال کے کل کا احاطہ نہیں کرتا۔ اس کل کے دیگر اجزا بھی نظر میں ہوں تو آپ کی یہ رائے یا تاثر ایک غیر ضروری بلکہ غلط فہمی کی حدوں کو چھوتی ہوئی تعمیم پر دلالت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ فلسفے کی خبر اور ذوق رکھتے ہیں، یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ یہ نہ جانتے ہوں کہ کسی خاص فکر کی فلسفیانہ validity جانچنے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اس کی ماہیت اور غایت کا تعین کیا جائے، اور پھر یہ دیکھا جائے کہ ان دونوں کا نقطۂ اتحاد کس عنوان کا متقاضی ہے۔ یعنی ماہیت = فکر کی نظری ساخت اور غایت = فکر کا عملی مقصود ایک دوسرے میں ڈھل کر جو صورت بناتے ہیں، وہ بتاتی ہے کہ فلاں فکر اپنی کلیت میں کیا ہے۔ اور شعور کے کس اقتضا سے نسبت رکھتی ہے! آپ کے آگے تشریحی اور توضیحی

اسلوب اختیار کرنا خود میرے لیے باعث شرم ہوگا، اس لیے درمیانی مراحل کو پھلانگ کر یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ فکر اقبال کی نظری بناوٹ یا داخلی منطق تو بلاشبہ مخدوش اور مضطرب ہے، لیکن اس کا عملی مقصود شعور اخلاقی کا حقیقی مقتضا ہے۔ علامہ نے شعور کے علمی اور اخلاقی مطالبات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی جو کاوش کی' اُس کا نتیجہ اگر فکر کی اندرونی دولختی کی شکل میں نہ نکلتا تو تعجب تھا۔ اس ناگزیر دولختی کو زیادہ سے زیادہ کم کرنے کا وہی طریقہ ہوسکتا تھا جو انہوں نے اپنایا: جمالیاتی تخیل کا فکری اور اخلاقی مصرف نکالنا یا بالفاظ دیگر فکر کی اخلاقی + جمالیاتی تشکیل۔ کسی علمی یا اخلاقی مؤقف کو جمالیاتی pattern دے دیا جائے تو بعض تجاوزات اور اندرونی ناہمواریاں نبھ جاتی ہیں اور وہ مؤقف کانٹ کی سی تنقیدی تحلیل سے بھی بڑی حد تک بچا رہتا ہے۔

اقبال کا منہاج فکر' جس قدر متعین ہوسکتا ہے' 'مذہبی' 'اخلاقی' ہے۔ اس فکر کے اہداف چونکہ نظری نہیں ہوتے لہٰذا ان کا حصول بعض ناگزیر علمی ذرائع کے استعمال کے باوجود محض ذہنی نہیں ہوتا۔ یہاں حصول' استحضار پر موقوف ہے۔ اُس مقصود کا استحضار جس کا ثبوت فقط عقل پر مبنی نہیں ہے۔ اپنی فکر کے اس بنیادی مطالبے کو مفکر اقبال نے کم اور شاعر اقبال نے زیادہ پورا کیا۔

گفتگو میں خاصی سہولت پیدا ہو جائے گی، اگر میں آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرواسکوں کہ مسلمہ اخلاقی مقاصد کا پیرایۂ استحضار جمالیاتی نہ ہو تو فکر کی حرکت مذہبی یا مابعد الطبیعی معانی کے رُخ پر نہیں ہوسکتی۔ مذہبی و اخلاقی فکر میں معنی پذیری اور معنی آفرینی کا جوہر جمالیاتی شعور کی کمک کے بغیر جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ اقبال کے ہاں اس جوہر کی کارفرمائی ایک ایسی متوازیت کی حامل ہے جس میں موضوع باعتبار صورت و معنی منقسم ہو جاتا ہے۔ اُن کا فکری مطلوب صورت و معنی کی جس ترکیب کے ساتھ realize ہوتا ہے' اُس میں صورت تخیلی ہے اور معنی حسی' اور یہ لازمہ ہے اخلاقی شعور اور جمالیاتی شعور کی یکجائی کا۔ جمال' حقیقت کی صورت ہے اور اخلاق، صورت کی حقیقت۔ اس اصول کا کوئی بھی بیان استدلالی نہیں ہوسکتا۔ استدلال سے اس کا حقیقی ہونا مجروح ہو جائے گا۔ آپ ہی بتلایئے: غایت اخلاقی ہے اور اس کی طرف پیش رفت کا اسلوب جمالیاتی...... اس صورت حال میں نظری استدلال کے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے؟ ہاں اگر آپ کا اشارہ عملی استدلال کی طرف بھی ہے تو میں آپ سے متفق ہونے پر مجبور ہوں۔ اقبال کے ہاں استدلال کا عملی طریقہ کثرت سے برتا گیا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اس طریقے پر اُن کی گرفت ماہرانہ تو ہے' مفکرانہ اور محققانہ نہیں۔ وہ مابعد الطبیعیاتی حقائق کی تصدیق اور اثبات کے لیے بھی اسی طریقے پر بھروسا کرتے ہیں۔ خیر اس مسئلے پر پچھلے صفحات میں خاصی گفتگو ہو چکی ہے۔ فی الوقت یہ دیکھنا تھا کہ اقبال کا منہاج فکر کیا ہے اور وہ اس کے تقاضے کہاں تک پورے کرتے ہیں۔ نیز یہ بھی کہ خود اس منہاج کی حیثیت اور قدر و قیمت کیا ہے؟ اس کا تعین اگر فلسفے کو نظر انداز کر کے ہوتا ہے تو اس میں بھی کیا حرج ہے!